Date of Publication: 02-05-2013

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 May 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 May 2013
Issue: 18, Vol.:72

۸ تا ۱۴ مئی ۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر: ۱۸، جلد نمبر: ۷۲

کلیم الدین احمد کا یہ معرکہ آرا مضمون سید احتشام حسین کی کتاب 'تنقیدی نظریات' حصہ اول سے لیا جارہا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۸ میں ترتیب دی گئی تھی۔ اترپردیش اردو اکادمی نے بھی اس کتاب کو ۲۰۰۹ میں شائع کردیا ہے۔ یہ مضمون تنقید پر اتنا وقیع ہے کہ اپنی اشاعت کی نصف صدی، وہ نصف صدی جو تنقید کے سب سے زیادہ فروغ سے عبارت ہے، کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ تازہ کار ہے بلکہ ہمیں اپنے رویوں کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور تنقید کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے زمانے کے نام نہاد نقاد بھی تنقید کے منصب سے اس طرح آگاہ نہیں ہیں جس کا مطالبہ یہ مضمون ادب کے نقاد اور قاری دونوں سے کرتا ہے اور اسی لیے یہ مضمون یہاں نقل کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

تنقید اور ادبی تنقید

(پہلی قسط)

پروفیسر
کلیم الدین
احمد

(1)

"تنقید ہماری زندگی کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی سانس"۔

یہ جملہ ایلیٹ کا ہے اور میری نظر میں بڑا گہن اور بڑی گہرائی اپنے اندر رکھتا ہے۔ گرچہ شواہد ایسے موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ خود ایلیٹ کے نزدیک کوئی عمق اور کوئی گہرائی اس جملے میں نہ تھی۔ یہ بات اتفاقاً کسی اضطراری جذبے کے تحت اس کے قلم سے نکل گئی تھی، اسے محسوس تک نہ ہوا کہ وہ کیا کہہ گیا۔ حالاں کہ اس سیدھے سادے جملے نے واقعتاً سب سے بڑی اور بیش بہا صداقت کا سراغ لگا لیا ہے، اس جملے کو ایک مرتبہ پھر پڑھیے، وہ کہتا ہے: "تنقید ہماری زندگی کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی سانس" اور یہ واقعہ ہے کہ تنقید ایک فطری نعمت اور بیش بہا ودیعت ہے، اتنی ہی فطری اور بیش بہا جتنی کہ 'بینائی' یا 'گویائی' کی نعمت ہے بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ لیکن بینائی یا گویائی ہی کی قدر و قیمت کو ہم پوری طرح کب پہچانتے ہیں؟ عام طور پر تو لوگوں نے بس فرض سا کرلیا ہے کہ ہاں یہ چیزیں بھی ہیں حالاں کہ یہ چیزیں بھی اتنی ہی ناگزیر ہیں جتنی کہ تنفس کی آمد و شد ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ اصل یہ ہے کہ نعمتوں کی 'فطریت' اور 'ناگزیری' نے ان کی حقیقی قدر و قیمت اور حیثیت اور منزلت کو ہماری نظر سے اوجھل کردیا ہے، بچہ اپنی آنکھوں کو استعمال کرتا ہے اور ان کا استعمال خود بخود ہی سیکھتا ہے، اس کی قوت گویائی نشوونما پاتی ہے تو اس کی نشوونما بھی تقریباً آپ ہی آپ ہوتی ہے۔ اس میں ایک بات یہاں اور جوڑ لیجیے کہ بچے کی تنقیدی صلاحیت و استعداد بھی اسی طرح بالکل فطری اور طبعی انداز سے خود بخود پھوٹتی اور ابھرتی ہے۔ یہ صلاحیت بڑی دھیمی رفتار سے ابھرتی ہے اور بالکل غیر مرئی ہوتی ہے اگرچہ ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جہاں ہم اسے دیکھ بھی سکتے ہیں کہ فرق و تمیز کی صلاحیت بچے کے اندر صاف نمایاں ہے مثلاً دو کھلونے اس کے سامنے رکھ دیجیے پھر دیکھیے ان میں سے ایک کو وہ پسند کرلے گا اور دوسرے کو صاف رد کردے گا۔

فرق و تمیز کی اس صلاحیت کا ظہور ہوتا تو آغاز ہی سے ہے مگر ابتدا میں وہ 'طبعی جبلت' کا انداز لیے ہوتی ہے، بچہ تمیز تو کرتا ہے مگر اس معاملۂ تمیز میں وہ کسی ناقابل فہم جبلت کے زیر اثر ہوتا ہے، وہ جو کچھ بھی کرتا ہے سوچ سمجھ کے نہیں کرتا۔ اسے مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اس نے جو فلاں حرکت کی تو اس کا اصلی سبب اور محرک کیا تھا، وہ کون سی چیز تھی جو اس عمل کی موجب ہوئی یا اگر کچھ آگہی اس کو ہوگی بھی تو بہت ہی دھندلی دھندلی اور گول مول سی ہوتی ہوگی وہ اپنے کسی عمل کے 'سبب' سے نہ تو پوری طرح خود آگاہ ہوتا ہے نہ اپنی اس 'معقولیت' سے کسی دوسرے کو آگاہ کرسکتا ہے۔ قوت نقد و انتقاد تو بیشک موجود ہوتی ہے مگر ناصاف اور غیر مربوط، وہ مختلف چیزوں میں تقابل کرتا ہے، امتیاز برتتا ہے، آنکتا بھی ہے اور تحسین بھی کرتا ہے لیکن اس کا یہ آنکنا اور تحسین کرنا ابتدائی سی اور شخصی نوعیت کی چیز ہوتی ہے اور اتنی ہی ڈانواں ڈول بھی، یعنی اس میں استقلال بالکل نہیں ہوتا اور جیسا کہ ابھی میں نے کہا، اس کی یہ کیفیت نہایت مبہم سی اور بے ربط ہوتی ہے۔

نقد و انتقاد اور فرق و امتیاز کی واضح اور مربوط صلاحیت کی کمی جس طرح بچوں میں ہوتی ہے اسی طرح جوانوں میں بھی ہوتی ہے، اس معاملے میں دونوں ملتے جلتے سے ہیں۔ عام طور پر ایک جوان آدمی بھی ان اسباب و وجوہ کی کوئی معقول توجیہ نہیں کرپاتا جن کی بنا پر اس کی پسند اور ناپسند کا جذبہ حرکت میں آتا ہے اور وہ ایک چیز کو تو قبول کرلیتا ہے اور دوسری کو مسترد کردیتا ہے، بعض خاص چیزوں کو دوسری چیزوں پر ترجیح دیتا ہے، ان میں باہم مقابلہ کرتا ہے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا ہے اور ایک خاص احساس کی سی کیفیت اس کے اندر پائی جاتی ہے، مگر پوچھیے کہ وجہ ترجیح کیا ہے، تو عموماً وہ یہی کہے گا کہ 'بس مجھے پسند ہے'۔ یہ انداز بیان کے اندر کوئی بات نہیں ہوتی۔ آج تنقید کے نام سے بھی

ہم جناب احمد رشید شروانی کے شکر گزار ہیں

ہم اردو کے خاموش خدمت گزار اور ممتاز محب اردو جناب احمد رشید شروانی کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنے ذاتی ذخیرے سے انجمن ترقی اردو (ہند) کی شبلی لائبریری کو مختلف اصناف پر مشتمل بیش عدد اہم اور نایاب کتب عطیہ کے طور پر عنایت فرمائی۔ انھوں نے اردو کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوکر انجمن ترقی اردو (ہند) کو ایک لاکھ روپے کا چیک بھی پیش کیا ہے۔ جناب احمد رشید شروانی کی شخصیت اہل اردو کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ وہ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ اتنی تو سے کی دہائی میں اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ و طالبات اور اساتذہ کی بہترین کارکردگی پر ان کی وہ زبردست حوصلہ افزائی کرتے تھے اور انھیں انعامات و اعزازات سے بھی نوازتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میڈیم طلبہ و طالبات بھی امتحانات میں نمایاں نمبروں سے کامیاب ہونے لگے بلکہ کچھ ریاستوں میں اردو میڈیم طالب علموں نے اول پوزیشن بھی حاصل کیں۔ اس پس منظر میں جناب احمد رشید شروانی کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ہم ایک بار پھر ان کی اس کرم فرمائی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ (ادارہ)

جتنی چیزیں گزر رہی ہیں ان میں بھی آپ یہی نقص پائیے گا۔ ان میں بڑی طاقت اور بڑا طنطنہ ہوگا، الفاظ و عبارات کی بھی خوب ہی بہتات ہوگی، دلائل بھی بڑے شاندار ہوں گے اور زاویہ نظر بھی بڑے شعور اور تمیزداریوں کا حامل معلوم ہوگا، لیکن غور کیجیے تو ان کی حیثیت بھی بنیادی طور پر اس جملے سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوگی جو عام طور پر لوگ اپنی روزمرہ کی پسند اور ناپسند کے معاملے میں ظاہر کرتے رہتے ہیں، یعنی وہی بے خبری، عناصر و اصول کی وہی بے شعوری، خود اپنے صادر کردہ فیصلوں کی نوعیت کی طرف وہی ریاسن سوچی پن کا، اور وہی فقدان نظم و ترتیب، اس لطافت و ذکاوت کا جو تسلی بخش کیفیات و نتائج کی واحد ضمانت تھی۔

یہ ممکن ہے کہ ایک نقاد ہوڈ کی نظم (Ode to Autumn) کو نہایت ہی لطیف و نفیس نظم تصور کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ملٹن کو ڈران پر ترجیح دے بلکہ یہ بھی ناممکن نہیں کہ اپنی اس ترجیح کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے بظاہر نہایت ہی مستحکم اور وقیع دلائل بھی پیش کردے لیکن آخری تجزیہ تحلیل کی میدان پر پہنچ کر تو یہ سارے دلائل عامیوں کے اس بے اعراد جملے سے نہ تو بہتر ہی نظر آئیں گے نہ مفید ہی، جو کہہ اٹھتے ہیں کہ "مجھے تو یہی پسند ہے"۔

یہ سچ ہے کہ تنقید اتنی ہی ناگزیر شے ہے جتنی نفس کی آمد و شد، اور اس کی نشوونما کا جو حال ہے اسے مشکل ہی سے تسلی بخش کہا جاسکتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگ اس کی طرف سے بڑی سخت بے گانہ وشی اور بے اعتنائی برتتے چلے آرہے ہیں اور ہماری بے حسی اور مردہ دلی کی یہ انتہائی حیرت ناک مثال ہے۔ تنقید کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ اسی طرح ناممکن، جیسے ہم سانس لینا چھوڑ دیں تو اسی لمحے مرجائیں۔ تنقید ہمارے دم کے ساتھ ہے، یہ ہماری محسن و مددگار ہے، ہمیں رستہ دکھاتی ہے اور سنبھالے رکھتی ہے۔ زندگی کا ایک ایک شعبہ اس کی قوت و اثر کو محسوس کرتا ہے اس کا ممنون کرم ہے، اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جس میں ہم تنقیدی فیصلے نہ کرتے ہوں، معاملہ چاہے نائیوں کے انتخاب کا ہو یا پیشے یا کاروبار کا، یا آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کا افلاطون یا ناٹکل کی تحسین ہو یا اکلز یا بورکیا کی تنقیص ۔۔۔ مادی آسائش و آرام پر تسکین روحانی کی برتری واضح کرنی ہو یا شیکسپیئر کو ایڈگر ویلس سے زیادہ اہم ثابت کرنا ۔۔۔ ہر جگہ، ہر چیز، ہر بات میں تنقیدی صلاحیت ہی ہماری راہنما ہوتی ہے۔ کوئی جج ہو یا چور، کوئی حاجی ہو یا تاجر، سائنس داں ہو یا عطائی، وکیل ہو یا ڈاکٹر، سپہ سالار ہو یا فلسفی حتیٰ کہ طوائف تک ۔۔۔ سب کے سب نقد و انتقاد میں غرق ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کامیابی منحصر اس بات پر ہے کہ وہ اپنی تنقیدی قابلیت و صلاحیت کا استعمال صحیح طور پر کرتا ہے یا نہیں۔

یہاں ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ میں نے اس لفظ تنقید کو ضرورت سے زیادہ ہمہ گیری بخش دی لیکن ذرا ٹھہریے اور غور کیجیے، آپ پر خود واضح ہوجائے گا کہ تنقید کے اس مفہوم میں نہ تو کوئی کمی کی گئی ہے نہ زیادتی۔ اصل یہ ہے کہ تنقید کا استعمال ایک مدت دراز سے بہت ہی محدود اور مخصوص معنوں میں ہوتا رہا ہے، اب تک اسے فقط 'ادبی تنقید' کے دائرے میں بند رکھا گیا ہے اس لیے ہمہ گیر صورت میں جب بھی اسے پیش کیا جائے گا ایک اچنبھا سا ضرور محسوس ہوگا، ورنہ ادبی تنقید تو نقد و انتقاد کی بے شمار شکلوں میں سے بس ایک شکل ہے اور غالباً بلند ترین بھی، مگر صرف اسی ایک شکل تک اس کو محدود رکھا گیا جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور قدر و منزلت بہت کم ہوگئی، اگرچہ خالص ادبی تنقید بھی بڑی گراں قدر چیز ہے اور اتنی ہی بیش بہا بھی ۔۔۔ تقابل، تجزیہ، فرق و امتیاز اور تعیّنِ قدر و مقام، تنقید کے 'چار پہیے' (یا عناصر اربعہ) ہیں۔ انتہائی کوڑدن سے کوڑدن اور لاابالی قسم کا آدمی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ شعوری یا تحت الشعوری طور پر ہم میں سے ایک ایک فرد، تقابل، تجزیہ، فرق و امتیاز اور تعیّنِ قدر و مقام کے عمل میں ہمہ دم مصروف ہے، یعنی ہم اگر چاہیں بھی تو اس 'عمل' کو روک نہیں سکتے جس میں ہم مستقل ڈوبے ہوئے ہیں نہ کسی ہوش مند آدمی کے خواب و خیال میں کبھی یہ بات آسکتی ہے کہ اس عمل کو روک دیا جائے اس کا روکنا تو خودکشی کے مرادف ہے۔

اگر آپ کو اپنا تحفظ و بقا مطلوب ہے تو اس کا راستہ یہی ہے کہ تنقید کو سمجھیے، اس کی حقیقی قدر و قیمت کو پہچانیے، اس کے صحیح استعمال کا طریقہ سیکھیے لیکن یہ راستہ اتنا آسان بھی نہیں کیوں کہ تنقید بلامبالغہ ایک بہروپیا ہے، ایسی ایسی شکلیں بدلتی ہے اور اتنی صورتیں اختیار کرتی ہے کہ اس پر قابو پانا بے حد دشوار ہے لیکن قابو پانا بہرحال ضروری ہے، ہم اس کے اسرار اور رموز سے ضرور واقف ہوسکتے ہیں بلکہ صاف لفظوں میں اسے یوں کہیے کہ تنقید کو ہمیں اپنا اصل موضوع اور مقصود بنانا چاہیے۔ تنقید ایک چمن ہے اور اپنے اس چمن کو ہمیں خود ہی سینچنا اور تیار کرنا پڑے گا۔ ہماری بے مغزانہ بلکہ مجرمانہ غفلت کی وجہ سے تنقیدی صلاحیت و استعداد کی جیسی کچھ نشوونما ہونی چاہیے ہو نہیں رہی ہے، ضرورت اسی لگن کی ہے کہ ٹھیک سے اس کی نشوونما ہو مگر اس کی پوری پوری نشوونما کا واحد ذریعہ تعلیم اور صحیح تربیت ہے اور اس تربیت کا آغاز بھی شروع سے ضروری ہے۔ اور جس قدر باقاعدگی بھی اس میں ممکن ہو تو برتی جانی چاہیے، بالخصوص تعلیم ہی کے زمانے سے کیوں کہ اس عمر میں آدمی کا دل و دماغ انتہائی اثر پذیر ہوتا ہے اور آسانی سے مڑنے اور ڈھلنے کی پوری صلاحیت اس میں رہتی ہے۔ ہاں یہ کہا تو جاسکتا ہے کہ تعلیم کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی، تربیت تو ہم پاتے ہی ہیں لیکن تعلیم گاہوں میں وہ تربیت ہمیں کہاں ملتی ہے جس کی طرف میں اشارہ کررہا ہوں۔ تعلیم کے زمانے میں ہماری قوت تنقید پراگندہ رہتی ہے اور اس کا ظہور اتفاقی ہوتا ہے اور کوئی معقول رہنمائی ہمیں مطلق نصیب نہیں ہوتی، وہاں تو ہم یوں ہی تیر چلاتے رہتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تب بھی زندگی بھر تیر تکے ہی چلا چلا کر کام نکالتے رہتے ہیں۔

اس تیر تکے والی کیفیت کو کیسے روکا جائے، اصل سوال یہ ہے۔ حیوانات کو دیکھیے، اس معاملے میں ان کے مقابلے ہم سے کہیں بہتر ہیں۔ تنقید کی بہ نسبت ان کو 'جبلت' کی شکل میں ودیعت ہوتی ہے اور بڑی حد تک ان کے تحفظ و بقا کا دار و مدار ان کی اسی جبلی قوت تمیز پر ہوتا ہے۔ ماقبل تاریخ انسانی کا آدمی بھی اسی قسم کی جبلت کا حامل تھا اور بچہ آج بھی اسی جبلت کا حامل ہوتا ہے، مگر جب بڑا ہوجاتا ہے تو اس کی یہ جبلت عقل و دانش بن جاتی ہے یا بن جانا چاہیے۔ ماقبل تاریخ انسانی کا آدمی اپنے اندر بہت ساری اور بھی جبلتیں تقریباً اسی قسم کی رکھتا تھا جیسی جانوروں کے اندر ہوتی ہیں، مگر عقل و تعقل کی نشوونما اور تمدن کی طرف اس کے تدریجی ارتقا نے ان جبلتوں کو پژمردہ کردیا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ غیر ضروری ہوکر رہ گئیں، آخر ختم ہوگئیں۔ اور اب آدمی آہستہ آہستہ اپنی عقل و فہم پر اعتماد کرنے لگا اور یہ کیفیت بڑھتی چلی گئی۔ عقل و فہم کو جبلتوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہے، کیوں کہ جبلتیں آنکھ بند کرکے یکسر میکانکی انداز سے عمل کرتی ہیں اور ان کو اپنے اجزائے ترکیبی یا انجام عمل کا مطلق شعور نہیں ہوتا۔ لیکن عقل اس کے برخلاف آنکھ بند کرکے میکانکی انداز سے عمل نہیں کرتی۔ یہ جبلتوں سے بلند و برتر اس لیے بھی ہے کہ اسے اپنے وجود کی پوری طرح خبر ہوتی ہے۔ جبلتیں بقائے ہستی میں ہماری معاون و مددگار تو ہوسکتی ہیں لیکن عقل ہماری ترقیوں کے امکانات پیدا کرتی ہے، دروازے کھولتی ہے۔

پس تنقید ایک عقلی صلاحیت و استعداد ہے، اسے ڈھیلے ڈھالے انداز میں یوں کہیے کہ یہ ارتقا یافتہ اور مہذب و شائستہ شکل ہے جانوروں والی جبلت امتیاز کی اور اسی کی مہربانیوں سے تمدن وجود میں آیا ہے لہٰذا بہتر سے بہتر نتائج و ثمرات کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پرورش و پرداخت نہایت ہی احتیاط کے ساتھ کی جائے اور جسمانی صلاحیتوں کی طرح اس کو بھی ایک سخت اور مرتب قسم کے ضابطے کے ماتحت رکھا جائے یوں تو ہم لوگ اچھل کود بھی سکتے ہیں، دوڑ بھاگ بھی سکتے ہیں اور خوب چھلانگیں بھی لگا سکتے ہیں، لیکن سلیقے سے ناچنا اور ڈانس کرنا ہو تو اس میں حسن پیدا کرنے کے لیے یہ بڑا ضروری ہے کہ آدمی سخت سے سخت ریاضت و تربیت کی منزلوں سے گزرے، جسم پر، جسم کے اعصاب پر پورا پورا قابو اس کو حاصل ہو اور جسم کی ساری حرکتیں اور جنبشیں ایک بلند تر مقصد کے ماتحت اور مطیع ہوں، ٹھیک اسی طرح عقل و فہم کی صلاحیت و استعداد کو بھی باقاعدہ ترتیب دینا، اس پر قابو پانا اور ایک بلند تر مقصد کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔

بجز اس فوری ضرورت و احتیاج کے جو جسد وجود سے تعلق رکھتی ہے، جانوروں کو اور کسی بلند تر مقصد کا شعور نہیں مگر مہذب اور متمدن آدمی کی نظر اس فوری اور پیش پا افتادہ ضرورت و احتیاج سے پرے بھی پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ پڑنی چاہیے، اس کی نظر میں فقط زندہ رہنا کافی نہیں۔ وہ اس ہستی کو اس لائق بھی بنانا چاہتا ہے کہ یہ ہستی قابل اعتنا ثابت ہو اور بلند تر زندگانی اور رفیع الرتبت طرز حیات کا تصور بھی کرسکتا ہے اور اس کا طلبگار ہوتا ہے، اس بلند تر زندگانی اور رفیع الرتبت طرز حیات کی صحیح نوعیت کی بحث اس وقت میرے موضوع سے متعلق نہیں ہے لہٰذا یہاں صرف اتنا تسلیم کرلینا بھی کافی ہے کہ فقط زندہ رہنا نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ بلند اور بہتر صورت حیات کی طلب اس کی مراد ہے مگر یہ طلب پوری صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے کہ تنقید کا صحیح استعمال کیا جائے کیوں کہ ہمارے برتر اور اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ ۔۔۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، منحصر ہے اس بات پر ہے کہ بقائے ہستی کی فوری اور پیش پا افتادہ طلب و احتیاج سے پرے نظر رکھنے کی صلاحیت ہمارے اندر کتنی موجود ہے، ہم اس بات پر قانع نہیں ہوسکتے کہ ہمیں جو چیز جس حالت میں بھی مل جائے اسی حالت میں اس کو قبول کرلینے پر اکتفا کرلیں اور احوال و ظروف کے سامنے ہتھیار ڈال کر خود انھی کے سانچے میں ڈھل جائیں، جی نہیں ہم تو مسلسل غور و تامل سے کام لیتے ہیں، چیزوں کو خوب جانچتے اور پرکھتے ہیں، تب انہیں قبول کرتے ہیں یا مسترد کرتے ہیں، حیات کی مثال اس جوار (مد) کی سی ہے جو اپنی حرکت میں معلوم تو خاموش و دست خواب ہوتی ہے لیکن ہر زندہ چیز کو وہ آگے ہی بہائے لیے چلی جاتی ہے۔ ہر زندہ چیز ابھرتی اور بڑھتی ہوئی مد کے ساتھ ہے یہ ابھرتی بہتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بجز انسان کے، ایک انسان ہی ہے جو حیات کا تجسس کرتا ہے اس کے اسرار و رموز پر قابو پانے کی جدوجہد کرتا ہے اور ان کی قدر و قیمت اور حقیقت کو جانچتا، پرکھتا اور تولتا ہے۔

لہٰذا یہ واضح ہوا کہ تنقید کی قدر و قیمت کا انکار دراصل زندگانی کی قدر و قیمت کا انکار ہے اور اپنی ایک بیش بہا میراث کو قبول

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی شاعری میں سراپا نگاری

علیم صبا نویدی
(192، ٹرپلی کین ہائی روڈ، سکنڈ فلور، فلیٹ نمبر16، راکس منڈی اسٹریٹ، چینئی-600005)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے شعری مجموعے "لمحوں کی خوشبو" میں "نشانات" کے عنوان سے اس کتاب کا پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ جس میں ان کے ادبی سفر اور شوقِ شعر گوئی سے متعلق تمام باتیں بہ تفصیل آگئی ہیں۔ اس کو پڑھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ قرآن پاک کو حفظ کرنے سے اپنی علمی سفر کا آغاز کرنے والی یہ عظیم شخصیت کس طرح دھیرے دھیرے مختلف علوم و فنون میں اپنے قدم جماتی ہے اور ایک دن ایک صحافی، ایک محقق، ایک نثر نگار اور ایک بلند پایہ شاعر بن کر اپنے آپ کو دنیا سے منوالی ہے۔ اس طرح کی شخصیت کو خود ساختہ انسان Self made man کہنا کسی طرح بے جا نہیں ہوگا۔ آپ کا عظیم ترین کارنامہ 'کلیاتِ ذوق' کی ترتیب ہے جس پر موصوف کو ڈی لٹ کی ڈگری ہی نہیں تفویض کی گئی بلکہ 'ذوق' کی بازیافت کا سہرا بھی آپ کے سر باندھا گیا۔ 'اصول تحقیق و ترتیب متن' آپ کا شاہکار مقالہ ہے جس کے باعث آپ کو عظیم علمی اعزاز حاصل ہوا۔ ان کے علاوہ آپ نے مختلف تصانیف کے تراجم بھی کیے ہیں اور اس طرح تحقیق اور تخلیقی کاوشوں میں آپ نے اپنی زندگی کا بہترین وقت صرف کیا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے آس پاس شعر گوئی کی کوششیں ۱۹۸۰ء تک رُک رُک کر اور سنبھل سنبھل کر جاری تھیں۔ آپ کی ابتدائی شعر گوئی کی باقاعدہ اصلاح کس نے کی اس کا تو کہیں ذکر نہیں ہے مگر آپ نے یہ جملے لکھ کر ہمارے تجسس کا ازالہ کیا ہے:

"اپنی شاعری اور شعری تخلیقات کو میں نے ہمیشہ خود ہی تنقیدی نظر سے دیکھا ہے۔ شعر و سخن میں میرا کوئی استاد نہیں ہے۔ اپنے بہت سے شعروں اور نظموں میں جتنی تبدیلیاں میں نے کی ہیں اس سے زیادہ کا تصور میرے لیے تو ذرا مشکل ہے۔ بعض شعر اور متعدد نظمیں تو زبانِ قلم سے سفینۂ قرطاس پر آنے کے بعد حکّ و اصلاح کے عمل سے اتنی بار گزری ہیں کہ ابتدا و انتہا کے مابین نہ جانے کتنے ذہنی فاصلے اور دائرے حائل ہو گئے۔ میرے یہاں شعر گوئی، کوزہ گری اور بت تراشی کے عمل سے مشابہ ہے محض آمدِ سخن سے نہیں"۔

اس حقیقت بیانی کے بعد یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ شاعر آمدِ سخن کے باوجود بھی اچھی شاعری کر سکتا ہے۔ اس کوزہ گری اور بت تراشی کا عمل شاعری میں شگفتگی، خوش آہنگی، ذاتی مشاہدات کی ہو بہو عکاسی اور ذاتی تجربات کا ہو بہو منظر نامہ پیش کرنے میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟

تنویر احمد علوی نے اپنی شاعری کے محاسن خود گنوائے ہیں تاکہ نقاد کو انھیں ڈھونڈ نکالنے کی زحمت نہ ہو وہ کہتے ہیں: "شعر میں مجھے شگفتگی اور خوش آہنگی پسند ہے۔ لفظوں کی صوتی موسیقی اور خوش رنگی کے بغیر شعری آہنگ کی تخلیق ممکن نہیں، اسی لیے مجھے مترنم قافیے اور حسن آہنگ رکھنے والی ردیفیں اور گوناگوں خوب صورت تشبیہیں اور دل نشیں ترکیبیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ روایت کو روایت کے طور پر دہرانا بیشتر اثر و تاثر سے خالی ہوتا ہے۔ روایت کی معنی آفریں کی توسیع لازمی ہے جس سے ذہن اور زندگی میں نئی معنویت اور اس کی توسیعات کو پایا جا سکے"۔

ان کے علاوہ وہ محاسن بھی ذکر میں آتے ہیں جو اچھی شاعری کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس مجموعے میں تنویر احمد علوی صاحب نے اپنی نظم 'سالوی' کو بڑی اہمیت دی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق پر آپ کو ناز ہے۔ سالوی کی اسطوری کردار کی بازیافت کا دعویٰ یقیناً درست ہے۔ یہی سالوی مختلف شعرا کے ہاں 'سلمٰی' کا نام و معیار لیتی ہے۔ بعضوں نے عام معشوق کو 'سلمٰی' قرار دے لیا ہے مگر جن لوگوں نے اس کردار کو بخوبی سمجھا ہے انھوں نے اس کو زندہ کردار بنا کر ہی پیش کیا ہے ورنہ یہ روایتی کردار سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کو نظم نگاری میں بڑی دل چسپی ہے۔ اس مجموعے میں زیادہ تر نظمیں ہی شامل کی گئی ہیں، چند غزلیں بھی ہیں۔ دو غزلیں فارسی میں بھی ہیں۔ نظموں میں بہت ساری نظمیں مختصر ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۸۳ء تک کے شعری سفر کا آئینہ ہے۔

مجموعے کی ابتدا نظم 'نذرِ شباب' سے ہوتی ہے۔ اس نظم کی اہمیت یہ ہے کہ یہ غیر مردّف غزل کے ڈھنگ سے کہی گئی ہے۔ لفظوں کی بندشوں اور فارسی تراکیب سے ڈاکٹر تنویر احمد علوی اپنے اشعار میں صوتی جمالیات کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ آپ کے ہاں الفاظ، استعارے، بندشیں وغیرہ رقص کناں نظر آتی ہیں۔ آپ طویل بحور سے کتراتے ہیں اس لیے اشعار میں خیالات کی کھینچا تانی نہیں ہوتی۔ اظہار میں سادگی اور روانی قابلِ غور ہے۔

'قطرہ قطرہ' میں فعولن فعولن کے وزن میں اشعار کی روانی قابلِ غور ہے۔ قاری کے ذہن پر ایک خوشگوار اثر ڈالنا ہی شاعر کا اہم مقصد ہے:

یہ ژولیدہ گیسو
یہ بالیدہ سنبل
یہ زلفِ پریشاں
یہ آوارہ کاکل
یہ تاتار سے اٹھنے والی گھٹائیں

ذرا غور کیجیے کہ اس طرح کا عمل 'آمد' نہیں بلکہ 'کوزہ گری' و 'سنگ تراشی' ہی کا عمل ہے مگر کتنا محتاط اور شعوری عمل ہے۔ آپ کی تمام نظموں میں آپ کے قول کی بھرپور صداقت ملتی ہے۔

'سالوی' میں ابتدائی کئی بند کسی حسینہ کے حسن و ادا اور رعنائیوں کی عکاسی کرتے ہیں اور یہ کوئی خاص اسطوری کردار نہیں ہے مگر درمیانی بندوں میں انجیلی واقعات کو حکایاتی انداز میں آگے بڑھایا تو نظم میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے، مثلاً:

کس قدر میں نے اس کو چاہا ہے
اس کی ہر بات کو سراہا ہے
پھر بھی وہ مجھ سے دور ہے کتنا
خود پہ اس کو غرور ہے کتنا
جنسِ عصیاں مجھے سمجھتا ہے
داغِ داماں مجھے سمجھتا ہے
اُف وہ وعدہ، وعید کیسے تھے
وہ رویے شدید کیسے تھے

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی یہ شاہکار نظم ہے اور اس ایک نظم میں آپ کی شاعری کے تمام محاسن اجاگر ہو جاتے ہیں، اس میں غزل کے اشعار کی طرح تغزل بھی ہے اور ایمائیت بھی۔ سراپا نگاری اور منظر کشی ہی کے باعث ان کی تخلیقات نظم کے زمرے میں داخل ہوتی ہیں ورنہ اگر قافیہ، ردیف کی قید ان میں شامل ہوتی تو وہ غزلیں بن جاتیں۔

آپ کی غزلوں سے بغیر انتخاب کے کسی بھی شعر کو غزل کا بہترین شعر قرار دیا جا سکتا ہے مگر آپ نے غزلیں بہت کم کہی ہیں، اس سے غزل پسند کرنے والے قارئین کو بہت کم حظ و نشاط کا موقع مل پایا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

اب اٹھا بھی تو ممکن نہیں دشت میں قدم
واپس ہوتا نہیں قدموں سے یہ چاہا بھی نہیں

یہ دشمنوں کی عنایت ہے کون مانے گا
جو واقعہ کرمِ دوستاں سا لگتا ہے

کیا ٹوٹ گئے آپ ہی تجسیم کے وہ دھاگے
وہ پیار کا ریشم دلِ بے تاب کہاں ہے

تنویر وہ زیست میں تنہا یہ سفر کیوں
وہ لطف کہاں، پرسشِ احباب کہاں ہے

مری غزل جو نئے ساز سے عبارت ہے
مرے نفس مری آواز سے عبارت ہے

نہ آسکا مرے اشعار میں تجسیم کا رنگ
جو اس کے منفرد انداز سے عبارت ہے

آپ کا فارسی کلام بھی قابلِ غور ہے مگر آپ نے اردو روایت کی طرح کیا فارسی روایت کو بھی ملحوظ رکھا ہے اس کا فیصلہ فارسی داں حضرات ہی کر سکتے ہیں، اس سلسلے میں یہاں کچھ کہنا اپنی بے بضاعتی کے باعث ناممکن ہے۔

مشاہیر کے خطوط

انجمن ترقی اردو (ہند) کے آرکائیوز میں بڑی تعداد میں اکابرین کے خطوط محفوظ ہیں، لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ اِدھر کچھ برسوں سے اکابرین کی تخصیص کے بغیر ہی ہمارے پاس خطوط آرہے ہیں اس لیے ہم نے طے کیا ہے کہ اب آرکائیوز میں صرف مشاہیر اور اکابرین کے ہی خطوط محفوظ کیے جائیں گے۔ لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ خطوط ارسال کرنے سے پہلے دیکھ لیں کہ مذکورہ خطوط اکابرین کے خطوط کے زمرے میں آتے ہیں کہ نہیں، ورنہ ایسے خطوط کا محفوظ کرنا ہمارے لیے مشکل ہے اور ایسے خطوط ضائع کردیے جائیں گے۔ (ادارہ)

اردو دُنیا

اردو ٹیچروں کی تقرری کی یقین دہانی

مطالبات کی فائل متعلقہ افسران کو ارسال

نئی دہلی (۲۳ راپریل)۔ فیڈریشن فار ایجوکیشن ڈیولپمنٹ کے وفد نے آج ای ڈی ایم سی کے کمشنر روی کمار سوامی سے ان کے دفتر میں ملاقات کی۔ کمشنر سے فیڈریشن کے جنرل سکریٹری شکیل احمد صدیقی نے کہا کہ ای ڈی ایم سی کے تحت 27 اردو میڈیم اسکول ہیں جن میں تقریباً 112 اردو اساتذہ کی تقرری کی جانی ہے، جب کہ ای ڈی ایم سی کے علاقوں میں واقع 388 جنرل اسکول ہیں وہاں بھی ایک ایک اردو اساتذہ کی تقرری کی جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کہا کہ ان تمام اسکولوں میں تقریباً ایک لاکھ طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ فیڈریشن کے چیئرمین عبدالعلیم برنی نے کہا کہ سیماپوری میں واقع اردو میڈیم اسکول کے طلبہ کو اسکول میں جگہ کی قلت کی وجہ سے دلشاد کالونی میں واقع اسکول میں شفٹ کر دیا گیا تھا لیکن ایم سی ڈی اب ان طلبہ کو دوبارہ سے سیماپوری کے اسکول میں شفٹ کرنے پر غور کر رہی ہے۔ انھوں نے ان طلبہ کو دلشاد کالونی میں ہی اضافی کمروں کی تعمیر کرکے تعلیم حاصل کرنے کا موقع دینے کی اپیل کی۔ اس معاملے میں شکیل احمد صدیقی نے کمشنر کو بتایا کہ ایک فائل چھ ماہ سے شاہدرہ شمالی زون میں ایجوکیشن محکمے کے پاس ہے لیکن اس پر کوئی کارروائی نہیں کی جا رہی ہے۔ انھوں نے کمشنر سے مطالبہ کیا کہ یہ ایک دو بچوں کا معاملہ نہیں ہے بلکہ 900 طلبہ کا معاملہ ہے اس لیے اس معاملے پر بہت ہی سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

فیڈریشن وفد کی باتیں سننے کے بعد کمشنر نے اردو اساتذہ کی تقرری کے سلسلے میں جواب دیا کہ میں اپنے ماتحت تمام اعلا افسران سے مشورہ کروں گا اور جلد ہی اس معاملے پر فیصلہ لیا جائے گا۔ انھوں نے وفد کے تمام مطالبوں کی فائل کو اسی وقت ایڈیشنل کمشنر شوبیر سنگھ اور ایجوکیشن ڈائرکٹر کے دفتر میں روانہ کرکے اس وفد کو بھی ان افسران سے ملاقات کرنے کے لیے کہا۔

وفد نے جب ایڈیشنل کمشنر سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا کہ ہم اردو اساتذہ کی تقرری پر غور و خوض کرنے کے بعد ہی فیصلہ لیں گے۔ جب ان کو یہ جانکاری دی گئی کہ کئی اسکولوں میں ایسے اردو اساتذہ کی تقرری کر دی گئی ہے جو اردو زبان کے بارے میں نہ تو کوئی جانکاری ہی رکھتے ہیں اور نہ ہی وہ اردو زبان میں طلبہ کو تعلیم دینے کے اہل ہیں۔ ایڈیشنل کمشنر نے ایسے اساتذہ کی لسٹ دینے کے لیے کہا جب کہ ایجوکیشن ڈائرکٹر کے دھمن نے وفد کو یقین دہانی کرائی کہ یہ 300 اردو اساتذہ کی تقرری کا معاملہ ہے اس لیے مجھے کمشنر سے صلاح مشورہ کرنا ہوگا اور ان اساتذہ کی تقرری کا مناسب راستہ نکالنا ہوگا۔ وفد میں ڈاکٹر انجمن بیہاں، عبدالقیوم، مولانا منہاج احمد قاسمی، محمد اسلم، ماسٹر سرور احمد، چودھری مستقیم اور فیڈریشن کے دیگر عہدے داران شامل تھے۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو کے ساتھ افسران کا رویہ افسوس ناک

ڈہری آن سون، بہار (۲۳ راپریل) ریاست میں اقلیتی طبقے کے درمیان نتیش کمار کی مقبولیت اور بیورو کریٹ کوئی افسران پسند نہیں کرتے ہیں جس کی وجہ سے ریاست کے سربراہ کے حکم اور ضابطے و قانون کو طاق پر رکھ کر کام کرتے ہیں۔ یہ باتیں نسیم احمد نے اپنے پریس بیان میں کہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد ۱۹۵۱ء میں حکومت بہار نے ہندی زبان کو ریاست کی علاقائی سرکاری زبان بنائی تھی جسے بہار آفیشیل لنگویج ایکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عوام کے مطالبے پر حکومت بہار نے آئین ہند کی دفعہ 345 کے تحت دیے گئے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اس ایکٹ میں ترمیم کرتے ہوئے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا بل ۱۹۸۱ء میں پاس کیا گیا جسے بہار آفیشیل لنگویج ترمیم ایکٹ ۱۹۸۱ء کہتے ہیں۔

نتیش کمار نے اپنے پہلے دور میں کہا تھا کہ مجھے مبارک بادیاں اردو میں بھی کافی ملی ہیں، اس لیے میں بھی اردو سیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ۱۶ رفروری ۲۰۱۱ء کو ایک حکم نامہ جاری کیا گیا تھا جس میں سنگ بنیاد، افتتاح، پارک، سڑک، آفس بلڈنگ کے علاوہ افسران کے نیم پلیٹ ہندی اور اردو میں لکھنے کا حکم کیا گیا۔ بھی محکمے کے پرنسپل سکریٹری، محکمے کے ہیڈ، کمشنر، آئی جی، ڈی آئی جی، ڈی ایم اور ایس پی کے علاوہ بورڈ اور کارپوریشن کے افسران کو سخت ہدایت جاری کی گئی تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس پر عمل نہ کرنے پر کارروائی کا انتباہ بھی دیا گیا تھا، مگر آج اس حکم نامے پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ انھوں نے وزیر اعلا سے مطالبہ کیا کہ اردو کے استعمال پر عمل درآمد کرائیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

ایم سی ڈی اسکول میں اردو کی تعلیم لازمی ہوگی

نئی دہلی (۱۶ راپریل)۔ سیتا رام بازار کے ایم سی ڈی پرائمری اسکول میں اب انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی لازمی طور پر پڑھائی جائے گی۔ ساتھ ہی اس اسکول میں تمام انتظامات مکمل کرکے ایک ہفتے کے اندر اسے شروع کر دیا جائے گا۔ یہ باتیں آج ہفتے کی کونسلر سیما طاہرہ نے اسکول کا دورہ کرنے کے دوران کہیں۔ ان کے ہمراہ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کی بھارتی اور نیرو نے اسکول کے پرنسپل اور اسٹاف سے ملاقات کی اور اسکول کا معائنہ بھی کیا۔ انھوں نے کہا کہ اسکول میں نئے فرنیچر، نئے پنکھے اور ٹھنڈے پانی کی مشین کا انتظام کیا جائے گا تاکہ گرمیوں میں بچوں کو راحت مل سکے۔ ان انتظامات کے بعد اسکول میں ایک ہفتے کے اندر تعلیم شروع کر دی جائے گی۔ سیما طاہرہ نے کہا کہ اسکول میں انگریزی اور اردو زبان میں تعلیم دی جائے گی۔ غور طلب ہے کہ یہ اسکول پہلے گلی شنکر میں چل رہا تھا، کانٹریکٹر اور کارپوریشن کے درمیان تنازع کی وجہ سے معاملہ عدالت میں تھا۔ عدالت سے معاملہ حل ہونے کے بعد اب یہ اسکول سیتارام بازار میں شروع کر دیا جائے گا۔ (انقلاب۔ دہلی)

حکومت اقلیتی اداروں میں اردو زبان کے افسروں کی تقرری کرے

پشپندر سنگھ

نئی دہلی (۱۸ راپریل)۔ دہلی اقلیتی کمیشن کی دسویں سکھ صلاح کار کمیٹی کی میٹنگ آج کمیشن کے دفتر میں سردار پشپندر سنگھ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر پشپندر سنگھ نے بتایا کہ پنجابی اور اردو زبان سے متعلق جو سروے کمیشن کے ذریعے کرایا گیا ہے اس کی ابتدائی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دہلی سرکار میں 65 دفتر اور 53 مختار ادارے ہیں، اگر ان سبھی میں پنجابی اور اردو زبان کے افسر کا تقرر کیا جائے تو 700 زبان افسران کی ضرورت پڑے گی۔ دہلی حکومت میں ایک لاکھ 70 ہزار ملازمین کام کرتے ہیں، جس کو دیکھتے ہوئے دہلی سرکار پر ان 700 زبان افسران کی تقرری سے کوئی خاص اقتصادی بوجھ نہیں پڑے گا۔ رپورٹ میں این ڈی ایم سی، کارپوریشن اور دہلی کنٹونمنٹ بورڈ میں بھی زبان افسران کی تقرری کی بات کی گئی ہے۔ رپورٹ میں ایک خاص بات یہ کی گئی ہے کہ لینگویج آفیشیل مانیٹرنگ سیل بھی بنانے کی صلاح دی گئی ہے جو ہر سال دونوں زبانوں کی پروگریس رپورٹ بھی تیار کرے گا۔ پشپندر سنگھ نے بتایا کہ کمیشن کے ذریعے آئندہ ماہ اس رپورٹ کی فائنل کاپی دہلی کی وزیر اعلا شیلا دکشت کو پیش کی جائے گی۔ اس موقع پر دہلی اقلیتی کمیشن کے ممبر اے سی مائیکل نے بھی میٹنگ سے خطاب کیا۔ اس موقع پر پرتاپ سنگھ ڈی آئی جی، آر ایس سہانی، کرنل سہانی، دیویندر سنگھ کواترا، سریندر سنگھ، علامہ رفیق ٹرسٹ کے ماسٹر مقصود احمد، سید علی احمد، محمد عثمان، محمد ذیشان و دیگر موجود تھے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو اساتذہ کی تقرری کا فیصلہ جلد نافذ کیا جائے

نئی دہلی (۱۸ راپریل)۔ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر مولانا سید ارشد مدنی نے اترپردیش سرکار کے ذریعے اردو اساتذہ کی تقرری میں ٹی ای ٹی کی لازمیت کو ختم کرنے اور تقرری کے لیے نئے نظام کو منظوری دینے کا خیر مقدم کیا ہے اور اترپردیش کے وزیر اعلا سے کہا ہے کہ اس فیصلے کو فوری طور سے عملی جامہ پہنایا جائے۔ مولانا سید ارشد مدنی نے کہا کہ اترپردیش کابینہ کا یہ فیصلہ قابل ستائش ہے اور اس پر عمل درآمد کرکے اترپردیش کے اسکولوں میں مدت سے خالی پڑی اردو اساتذہ کی اسامیوں کو پُر کیا جا سکے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے ٹی ای ٹی کی لازمیت کے سبب ان اسامیوں کو پُر کیے جانے میں دقت پیش آ رہی تھی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اردو اساتذہ کے تقرر کے لیے معلم کی سند کو منظوری دے، اس مطالبے کو بھی تسلیم کر لیا گیا ہے اور معلم سند یافتہ امیدوار ان تقرری کے اہل ہوں گے۔ مولانا سید ارشد مدنی نے کہا کہ حکومت کو اب اس فیصلے پر فوری طور سے عمل کرنا چاہیے تاکہ اس سے مسلم نوجوانوں کو روزگار اور طلبہ کو جلد ہی اساتذہ مل سکیں۔

واضح ہو کہ مولانا سید ارشد مدنی نے گزشتہ ۱۶ راپریل کو لکھنؤ میں اترپردیش کے وزیر اعلا اکھلیش یادو سے ملاقات کے دوران انھیں جو نوں رکنی ڈیلی گیشن چارٹر پیش کیا تھا اس میں دیگر اہم ایشوز کے ساتھ جلد سے جلد اردو اساتذہ کی تقرریاں کرنے اور ان تقرریوں میں ٹی ای ٹی کی لازمیت کو ختم کیے جانے کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ واضح ہو کہ اترپردیش کے اسکولوں میں اس وقت اردو اساتذہ کی 2911 اسامیاں خالی پڑی ہیں، جن پر اب اترپردیش کابینہ نے تین ہزار اردو اساتذہ کی تقرری کو اپنی منظوری دے دی ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

ریاستی حکومت اردو میڈیم اسکولوں کا قیام کرے

دیوبند (۲۳ رمارچ)۔ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن دیوبند یونٹ کی ایک میٹنگ کا انعقاد دارالعلوم چوک پر واقع مسلم فنڈ کمرشیل انسٹی ٹیوٹ میں کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت ریاستی سکریٹری راؤ عبدالستار جب کہ نظامت ہارون انصاری نے کی۔ اس موقع پر راؤ عبدالستار نے کہا کہ تنظیم کے قیام کا مقصد اردو کا فروغ اور اردو اساتذہ کے مسائل کے لیے اجتماعی جدوجہد کرنا ہے۔ انھوں نے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ حسب اعلان صوبے میں اردو میڈیم اسکولوں کا قیام کرے اور اردو کتابوں کی تقسیم بھی وقت پر دیگر نصاب کی کتابوں کے ساتھ کی جائے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو زبان کے ساتھ مکمل انصاف کا مطالبہ

حیدرآباد (۲۴ر مارچ)۔ جناب محمد اسماعیل الرب انصاری (وائس چیئرمین آندھرا پردیش کانگریس کمیٹی اقلیتی ڈپارٹمنٹ وانچارج امور اردو) نے اردو زبان کی ترقی وترویج اور اردو زبان کے ساتھ مکمل انصاف کرنے اور جن اضلاع میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے وہاں مکمل عمل آوری، تمام سرکاری محکموں میں اردو ٹرانسلیٹرس کے تقررات، تمام سرکاری محکموں، آر ٹی سی کی بسوں پر اردو کے بورڈ آویزاں کرنے، شہر حیدرآباد میں عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد، اردو میڈیم سرکاری مدارس کی بہتر نگہداشت، اردو میڈیم طلبہ کو تمام سرکاری سہولتیں مہیا کرنے، اردو زبان کو روزگار کی زبان بنانے جیسے اہم مسائل پر جناب محمد سراج الدین (چیئرمین اقلیتی ڈپارٹمنٹ کانگریس کمیٹی)، جناب محمد فاروق حسین (ایم ایل سی)، جناب شیخ مستان علی (ایم ایل اے کانگریس)، جناب محمد اسماعیل اعجاز کے علاوہ کانگریس کے دیگر قائدین کے ساتھ چیف منسٹر آندھرا پردیش کرن کمار ریڈی سے ملاقات کی۔ انصاری صاحب نے کہا کہ اردو والوں کے جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت کو چاہیے کہ اردو جیسی سیکولر زبان کے ساتھ مکمل انصاف کیا جائے جس پر چیف منسٹر کرن کمار ریڈی نے کہا کہ حکومت ہر حال میں اردو کے ساتھ مکمل انصاف کرے گی۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو مترجمین کی تقرری میں انتظامیہ کا ایک اور مذاق

تقرریوں میں بھی اتنی لاپروائی ہے کہ کبھی عمر غلط درج ہوتی ہے تو کبھی تاریخ

فیروز آباد (۲۰ر اپریل)۔ غالب ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر ماسٹر اظہر نعیم کی رہائش پر ایک نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں انھوں نے بتایا کہ گزشتہ دنوں مقامی انتظامیہ کی جانب سے ۹ اردو مترجمین کی تقرری کا اشتہار اخبارات کے ذریعے منظر عام پر آیا تھا، جس میں بہت ساری شرائط کے ساتھ ایک شرط یہ بھی تھی کہ زیادہ سے زیادہ ۳۱ سال کی عمر تک کے افراد ہی اس عہدے کے اہل ہوں گے، جب کہ دو چار دن کے آگے پیچھے سے ایسا ہی ایک اشتہار آگرہ ضلع مجسٹریٹ کی جانب سے بھی نکالا گیا جس میں واضح طور پر یہ لکھا گیا تھا کہ چالیس برس تک کی عمر کے بے روزگار اس عہدے کے لیے اہل ٹھہرائے جائیں گے۔ آگرہ کے اشتہار کو لے کر جب کچھ بے روزگاروں نے مقامی انتظامیہ سے ملاقات کی تو ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انتظامیہ کی جانب سے ایک اور اشتہار نکالا گیا، جس میں زیادہ سے زیادہ عمر چالیس برس مقرر کی گئی۔ دونوں اشتہارات میں یہ لکھا گیا تھا کہ اس اشتہار کے شائع ہونے کے تیس دن کے اندر اندر اپنی اپنی عرضی داخل کر سکتے ہیں۔ پہلے والے اشتہار کے حساب سے عرضی دینے کی آخری تاریخ ۹ر اپریل تھی، لیکن نیا اشتہار شائع ہونے پر یہ تاریخ ۱۱ر اپریل ہونی چاہیے تھی، جس کی روشنی میں ہزاروں بے روزگار جو عمر کی قید کے سبب عرضی داخل نہیں کر رہے تھے، انھوں نے بھی عرضی بھیجنا شروع کر دیا، لیکن گزشتہ دو تین دن کے اندر ہزاروں ایسی عرضی جو ۹ر اپریل کے بعد ضلع مجسٹریٹ کے دفتر میں پہنچیں ان کو واپس کر دیا گیا۔

نشست میں موجود لوگوں نے غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انتظامیہ ایسے بے روزگاروں کی عرضی واپس کر کے ان کے ساتھ بھونڈا مذاق کر رہی ہے۔ سماجی کارکن سردار احمد خاں نے مطالبہ کیا کہ ضلع مجسٹریٹ کی جانب سے دوبارہ اشتہار شائع کیا جانا چاہیے اور ان بے روزگاروں کو ایک موقع اور ملنا چاہیے جن کی عرضی انتظامیہ کی جانب سے واپس کر دی گئی ہیں۔ عرضی دینے والے ایک بے روزگار عمر نثار نے بتایا کہ جب ہماری عرضی واپس ہمارے گھر پہنچی تو ہم پریشان ہو کر ضلع مجسٹریٹ کے دفتر پہنچے، لیکن ہم کو ایک محکمہ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے محکمہ پر بھیجا جاتا رہا، کوئی ہماری عرضی کی واپسی کی وجہ بتانے کو تیار نہیں تھا۔ دفتر کے کچھ ملازمین کا کہنا تھا کہ آپ ایک بار پھر پوسٹ کر دیجیے۔ حالاں کہ ہم نے اور ہمارے جیسے ہزاروں اور بے روزگاروں نے ایک بار پھر سے چالیس چالیس روپے رجسٹری میں خرچ کر دیے ہیں، لیکن ہم کو امید کی کوئی شعاع نظر نہیں آتی کہ اس بار ہماری عرضی قبول ہو ہی جائے گی۔ اردو کلب کے صدر ماسٹر نصیر الدین ملک نے کہا کہ اردو والوں کو اردو مترجمین کی صرف ۹ اسامیوں پر تقرری کے اشتہار پر ہی اعتراض تھا، کیوں کہ یہ تو وہ عہدے ہیں جو کسی کے مستعفی یا ریٹائر ہونے کی وجہ سے خالی پڑے تھے، اس پر تقرری کر کے حکومت نے اردو والوں پر کیا احسان کیا ہے، قاعدے سے تو حکومت کی جانب سے نئی تقرری کا وعدہ کیا گیا تھا، اس وعدے کو پورا کرنا چاہیے تھا، لیکن یہاں تو ۹ تقرریوں میں بھی اتنی لاپروائی ہے کہ کبھی عمر غلط شائع ہوتی ہے تو کبھی تاریخ اور یہ تو حد ہی ہو گئی کہ آخری تاریخ باقی بچتے ہوئے بھی عرضی واپس کی جا رہی ہے۔ نشست میں محسن الدین، اشفاق بانو، امروز الدین، محمد نسیم، سنجیدہ ناصر، ریحانہ، دانش فریدی، شعیب شاہد و دیگر بے روزگاروں نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو کو خود سے الگ رکھ کر ہندوستان مکمل نہیں ہو سکتا: کپل سبل

غالب کو بھارت رتن سے نوازا جائے: جسٹس کاٹجو

نئی دہلی (۱۲ر اپریل)۔ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اسے روزگار سے جوڑنا بہت ضروری ہے۔ اردو اقلیتوں یا مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی زبان ہے، ہم سب کی زبان ہے۔ اردو زبان ہماری تہذیب وثقافت کی علامت ہے، اس کے تحفظ کے لیے حکومت اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر برائے مواصلات کپل سبل نے آج دہلی پبلک اسکول (متھرا روڈ) کے سبزہ زار پر جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقد 'مشاعرۂ جشن بہار' میں بطور مہمان خصوصی تقریر کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی وترویج کے لیے یہ ضروری ہے کہ اردو کو روزگار اور جدید ترین ٹیکنالوجی سے ہمکنار کرایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے لیے ہماری وزارت نے اردو میں گوگل سرچ انجن تیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اردو کا سرچ انجن تیار ہو جانے پر نہ صرف یہ کہ اس زبان کو وسعت ملے گی بلکہ نئی نسل کے لیے روزگار کے نئے مواقع بھی فراہم ہوں گے۔ کپل سبل نے کہا کہ آج کے دور میں جدید ٹیکنالوجی کے بغیر مکمل ترقی ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسی طرح اردو کو خود سے الگ رکھ کر ہندوستان مکمل نہیں ہو سکتا۔

مشاعرۂ جشن بہار کے مہمان ذی وقار پریس کونسل آف انڈیا کے چیئرمین جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک بار پھر مطالبہ کیا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بھارت رتن سے نوازا جائے۔ انھوں نے کہا کہ غالب کو بھارت رتن دے کر ہم غالب کا قد نہیں بڑھائیں گے بلکہ اپنے وقار میں اضافہ کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ جب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر اور سردار پٹیل کو ان کے مرنے کے برسوں بعد بھارت رتن دیا جا سکتا ہے تو غالب کو یہ ایوارڈ دینے پر اعتراض کیوں؟ انھوں نے کہا کہ میں نے متعدد زبانوں کی شاعری پڑھی ہے لیکن دل کو چھو لینے والی جو شاعری اردو زبان میں ہے وہ دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب اردو کا جھنڈا بلند کرنے کا وقت ہے، اس کے لیے ہم پورے ملک میں اردو وراثت کارواں نکال رہے ہیں۔

صدارتی تقریر میں جاپان کے پروفیسر ہیروجی کتاؤکا نے کہا کہ وہ شاعر تو نہیں ہیں لیکن ادب وثقافت کا مضمون پڑھاتے ہیں، اس کے لیے انھوں نے اردو شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔ پروفیسر ہیروجی کتاؤکا نے کہا کہ جب انھوں نے غالب، اقبال اور میر تقی میر کا مطالعہ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دوسرے ممالک میں جو شاعری آج ہو رہی ہے وہ غالب اور میر ڈیڑھ دو سو سال پہلے ہی کر چکے۔ انھوں نے کہا کہ اب تک ہماری تمام توجہ یورپ کے ادب پر تھی لیکن اب ہمیں محسوس ہوا کہ ایشیائی ادب میں بہت کچھ ہے اور ہم اردو شعر وادب سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

اس سے قبل جشن بہار ٹرسٹ کی روح رواں کامنا پرساد نے کہا کہ زبانیں ہمارے وجود کی تشریح اور ہماری شخصیت و کردار کی تشکیل کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زبان ہی ہمیں باوقار بناتی ہے۔ کامنا پرساد نے مزید کہا کہ اردو ہماری تہذیب اور مشترکہ ثقافت کی امین ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو سے بہت کچھ لیتے ہیں لیکن جب اسے کچھ دینے کا وقت آتا ہے تو اسے فراموش کر دیتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے بغیر نہ تو ہماری پارلیمنٹ چلتی ہے اور نہ ہی سیاست دانوں کی تقریریں مکمل ہوتی ہیں۔ کامنا پرساد نے کہا کہ جشن بہار ٹرسٹ کا مقصد اردو کو اس کا حق دلانا ہے۔ کامنا پرساد نے اس موقعے پر معروف مصور مقبول فدا حسین کو خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

اس موقعے پر مرکزی وزیر کپل سبل نے دیوناگری رسم الخط میں اردو شاعری کی کتاب 'نظیر بے نظیر' کا اجرا بھی کیا۔ اس موقعے پر موجود اہم شخصیات میں کانگریس کے ترجمان راشد علوی، سابق چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی، سابق وزیر کوکب حمید، اترپردیش کے سابق وزیر ڈاکٹر سراج الدین احمد، آئی سی سی آر کے وائس چیئرمین سید شاہد مہدی، ایچ آر سہیل خاں، انور حلیم، سدھارتھ شری رام، ڈاکٹر وید لشور پاٹھک، کنول کمار اور اوشا شری رام سمیت ہزاروں شائقین موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

سائن بورڈوں پر اردو تحریر کا لزوم

چیف منسٹر کرن کمار ریڈی کی سرکاری زبان کمیشن کو ہدایت

حیدرآباد (۱۱ر اپریل)۔ چیف منسٹر کرن کمار ریڈی نے صدر سرکاری زبان کمیشن این بدھا پرساد کو ہدایت دی کہ وہ ان چودہ اضلاع میں جہاں اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے وہاں تجارتی اداروں اور سرکاری دفاتر کے سائن بورڈوں پر تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی لازمی طور پر شامل کرنے کے اقدامات کریں۔ سرکاری زبان کمیشن کی جانب سے کل لیبر کمشنر کے ذریعے احکامات جاری کیے گئے تھے کہ اگر تجارتی ادارے اور خاص طور پر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے سائن بورڈس پر تلگو شامل نہیں کریں گی تو ان کے خلاف قانونی کارروائی کے ساتھ ساتھ بھاری جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ اس ہدایت کے بعد کانگریس کے رکن قانون ساز کونسل محمد علی شبیر نے آج چیف منسٹر کرن کمار ریڈی اور صدر نشین سرکاری زبان کمیشن بدھا پرساد کو مکتوب روانہ کیا اور اس مسئلے پر توجہ مبذول کروائی۔ انھوں نے آگاہی کی تقریب میں چیف منسٹر کی موجودگی میں صدر نشین سرکاری زبان کمیشن سے اردو زبان کو نظر انداز کرنے کی شکایت کی۔ چیف منسٹر نے بھی اس مسئلے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ جہاں اردو دوسری سرکاری زبان کا موقف رکھتی ہے وہاں سائن بورڈوں پر تلگو کے ساتھ اردو کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ بدھا پرساد نے اس مسئلے کا جائزہ لینے اور لیبر کمشنر کی جانب سے ضروری ہدایات جاری کرنے کے لیے بہت جلد اقلیتی عوامی نمائندوں اور اردو تنظیموں کے ذمہ داروں کے ساتھ اجلاس طلب کرنے کا یقین دلایا۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : کامریڈ منٹو
مصنف : علی احمد فاطمی
ضخامت : ۲۱۶صفحات
قیمت : ۲۰۰روپے
ناشر : رحمان پبلی کیشنز، سی-A۲
کریلی کالونی، الہ آباد-۱۶
(اتر پردیش)
مبصر : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سعادت حسن منٹو کی زندگی کا سفر اشتراکی فکر و عمل کے ساتھ شروع ہوا اور انھوں نے اس نظریے کی ترویج میں بڑے انہماک کے ساتھ کام کیا۔ ابتدا میں ان کے افسانے مزدوروں اور سماج کے پسماندہ طبقے کی نمائندگی کرتے تھے۔ چناں چہ منٹو بچپن میں شریر، باغی اور ہنگامہ پرور تھا یہ اس کی خوش قسمتی رہی کہ اس کو اشتراکی ادیب باری علیگ جیسا رہنما ملا جس نے اسے اشتراکی ادب کی طرف مائل کر دیا اور روسی ادب کے علاوہ وکٹر ہیوگو کا ناول اور آسکر وائلڈ کا ڈرامہ ترجمہ کروایا۔ تاہم اس کی ہنگامہ پروری ہمیشہ ہی اس کے ساتھ رہی اور اس کی بدنامی کا موجب بن گئی۔ بعد میں منٹو فرائیڈ کے نفسیاتی تحریک کا گرویدہ ہو گیا اور اس طرح اپنی ڈگر سے ہٹ گیا۔

زیر نظر کتاب سے صاف ظاہر ہے کہ علی احمد فاطمی نے منٹو کے اشتراکی دور پر بھرپور روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جس سے اس کے اشتراکی فکر و عمل کا پتا چلتا ہے۔ کتاب میں منٹو کے دستیاب و نایاب مضامین شامل ہیں۔ چونکہ منٹو ابتدا میں باری علیگ کی رہنمائی میں روسی ادب سے بہت متاثر رہا اس لیے اس نے 'روسی ادب پر ایک طائرانہ نظر'، 'اشتراکی شاعری'، 'سرخ انقلاب اور کسان، مزدور، سرمایہ دار، زمیندار' جیسے مضامین تحریر کیے۔ اشتراکی نظریہ ساز 'کارل مارکس' اور روس کے مشہور اشتراکی قلم کاروں 'میکسم گورکی' اور 'چیخوف' کی حیات پر منٹو نے سیر حاصل مضامین رقم کیے۔ یہ سب مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب میں 'جان آف آرک کا مقدمہ (ڈرامائی روپ)' اور مقدمہ سرگزشت اسیر (Victor Hugo's Novel Les Miserables) جیسی انقلابی تحریریں اور منٹو کے وہ مضامین جن میں اس نے غریب، بے کس اور استحصال زدہ جنسی مزدوروں (Sex Workers) کی کسمپرسی بیان کی ہے مثلاً 'عصمت فروشی'، 'گناہ کی بیٹیاں، گناہ کے باپ'، 'مجھے بھی کچھ کہنا ہے'، 'مجھے شکایت ہے'، 'ترقی یافتہ قبرستان' اور 'مسوئی'۔ مشمولہ مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو کی ذہنی پرورش میں اشتراکیت کا بہت بڑا ہاتھ رہا اور آگے جا کر جب وہ فرائیڈ کے دائرۂ اثر میں آ کر نفسیات پر زور دینے لگا اس وقت بھی منٹو کے اکثر کردار غریب، مجبور اور استحصال زدہ جنسی مزدور اور ان کے دلال ہی رہے۔ مختلف مضامین سے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جو منٹو کی سوچ کو اجاگر کرتے ہیں:

☆ "گورکی کی صدا چیخوف کی شائستہ نرم و نازک اور گھٹی ہوئی آواز نہیں نہ وہ معلم اخلاق ٹالسٹائی کی کمزور زاہدانہ صدا ہے۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے شیر کی گرج ہے۔ چمکتی ہوئی بجلی کی کڑک ہے"۔ (میکسم گورکی)

☆ زندگی جیسی ہے، نہ کہ جیسی ہو سکتی ہے۔ خیال کی جا سکتی ہے یا ہوگی۔ یہ ہے گورکی کا فن اور یہی ہے روس کے دیگر افسانہ نگاروں کا راز"۔
(میکسم گورکی)

☆ ہر عورت ویشیا نہیں ہوتی لیکن ہر ویشیا عورت ہوتی ہے۔
(عصمت فروشی)

☆ مجھے شکایت ہے اپنے مضمون نگار بھائیوں سے، جن کی تحریریں دوسروں کی روزی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ مگر ان کے لیے ایک دھیلا بھی پیدا نہیں کرتیں۔ وہ مضمون لکھتے ہیں کسی خط لکھنے سے پیٹ بھر کر۔ وہ شعر لکھتے ہیں، کسی دوسرے کنویں سے اپنی پیاس بجھا کر۔ وہ مقالے لکھتے ہیں مگر اپنی ستر پوشی کا سامان حاصل کرنے کے لیے انھیں کوئی اور ہی کام کرنا پڑتا ہے"۔
(مجھے شکایت ہے)

کتاب کے مقدمے میں مصنف نے منٹو کے ذہنی ارتقا پر بڑی دقیقہ شناسی سے روشنی ڈالی ہے اور اپنی دلیل کے جواز میں منٹو کے چیدہ چیدہ مضامین پیش کیے ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ منٹو کو اشتراکیوں نے اپنی جماعت سے بے دخل کر دیا نہ کہ منٹو نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا حالانکہ کئی اشتراکیوں جیسے علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی نے اس کو انفرادی طور پر ہمیشہ سراہا۔ ایسے پس منظر میں منٹو کو 'کامریڈ' کہنا کہاں تک واجب ہے، کچھ کہا نہیں جا سکتا کیوں کہ مارکسی نقطۂ نظر رکھنے والے ادیبوں نے اسے کبھی نہیں اپنایا۔ تاہم زیر نظر کتاب منٹویات میں ایک اہم اضافہ ہے اور منٹو کے ابتدائی سوچ و فکر کا آئینہ ہے۔

■◆■

بقیہ: تنقید اور ادبی تنقید

صفحہ ۲ سے آگے

کرنے سے انکار ہے، تنقید تو ایک صحیح تربیت پائے ہوئے شائستہ اور مہذب دماغ کا عمومی جوہر و وصف بھی ہے اور اس کی بے انتہا متنوع رنگارنگ خصوصی شکلیں بھی ہوتی ہیں

بہر صورت تنقید ناگزیر ہے، ماہر دینیات ہوں یا فلسفی، ڈاکٹر ہوں یا وکیل، یا کوئی سائنس داں، تنقید کے تو سبھی دست نگر ہیں اور ان کو چاہے کوئی علم اس کا ہو یا نہ ہو تنقید کی کسی نہ کسی خاص شکل پر ان کا انحصار ضرور ہے۔ ساری تحقیق و تفتیش، ساری تلاش و جستجو اور ساری قیاس آرائیاں چاہے وہ فکر و خیال کی ہوں، چاہے نباتات کی، چاہے روح کی۔ اگر ان سب کی ہدایت و انصرام کے لیے خصوصی اشکال و صور کے مرتب نقشے بھی موجود نہ ہوں تو ان میں بڑا انتشار پھیل جائے گا اور وہ قطعی بے ثمر ثابت ہوں گی۔ پھر وہ آلات جو بحفاظت تمام ان کو ساحل مراد تک پہنچانے کے لیے خاص طور پر بنائے گئے ہیں، اگر نہ ہوں تو یہ ساری چیزیں تو ادھر سے ادھر بھٹکتی پھرتی اور گھسٹتی پھریں گی ... یہ آلات کیا ہیں...؟ آلات تنقید! جو اسی مقصد کے لیے وجود میں آتے ہیں کہ وہ حاصل ہونے والے تمام اعداد و شمار کی چھان بین کریں، ان کو جوڑیں اور مرتب کریں، سنواریں اور درست کریں، جانچیں اور پرکھیں۔ لہٰذا وہ ماہر دینیات جو واقعات کو سند پر قبول کرتا ہے اور وہ سائنس داں جو کسی معقول سائنٹفک ثبوت کے بغیر کوئی چیز قبول نہیں کرتا، دونوں کو اپنے اپنے آلات پر یکساں اعتماد کرنا پڑتا ہے، یہ آلات بہت سے مواقع پر مادی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً نظام قانونی، جج، عدالتیں، قید خانے، پولیس اور قیدی یہ سب کے سب انہی کی ایک مادی صورت تو ہیں، اس پیچیدہ اور بے ڈھنگے نظام کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ چھان بین کی جائے، جانچا پرکھا اور فیصلے کیے جائیں، جالینوس کی قرابادین بھی یہی خدمت انجام دیتی ہے اور قرابادین ہی کی طرح عہد جدید کے علم طب کا مقصد بھی وہی ہے جس کے ذرائع اور وسائل لاتعداد ہیں۔ ماڈرن قرنطینی، آزمائشی نلکیاں اور دیگر آلات اور پھر ساز و سامان سے آراستہ عمل گاہیں سب اسی کی مثالیں ہیں۔

یہ ساری چیزیں اور بالخصوص مادی آلات بے انتہا مفید ہیں پھر بھی ان کی افادیت محدود ہے اور یہ کسی قسم کے معروف حلقۂ عمل میں کام دیتے ہیں۔ کسی مریض کی نسبت معلوم کرنا ہو کہ وہ بخار کی وجہ سے جاں بحق تسلیم ہوا یا السر کی وجہ سے تو اس معاملے میں سارے کا سارا نظام قانون بیکار ہے، اسی طرح بغاوت یا مداخلت بے جا کا فرق دریافت کرنا ہو تو قرابادین اس کی تشخیص میں قطعاً کوئی مدد نہیں پہنچا سکتی، پھر اس قسم کے بیشتر آلات مرض ہی کا پتا لگا سکتے ہیں یا جرائم کا مثلاً قانون کسی ملزم کے جرم کا یا کسی خاص جرم میں اس کی بے گناہی کا فیصلہ تو کر سکتا ہے لیکن یہ فیصلہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ وہ شخص طبعاً معصوم ہے۔ کسی قانون پسند شہری پر قانون بالواسطہ ہی اثر انداز ہوتا ہے، وہ اس کے بے شمار اعمالی خوبیوں اور نیکیوں پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا، قانون کا اصلاً تعلق سماجی خطا کاروں سے ہے، قانون پسند شہریوں سے نہیں، جیسے علم طب کا تعلق بیمار جسموں سے ہوتا ہے مگر طبعی طور پر جو آدمی صحت مند ہو اس کے حق میں میڈیکل سائنس کے جملہ اسباب و وسائل بالکل بے محل معلوم ہوں گے۔

بہر کیف رواج تنقید کے خصوصی مظاہر کو زیادہ وقتی کے ساتھ صرف انہی متعلقہ حلقوں تک محدود نہ رہنا چاہیے، زندگی بڑی پیچ در پیچ تنظیم ہے، اس کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے جدا گانہ تو ہیں مگر سب کے سب اسی لیے نا قابل تقسیم انداز سے باہم مربوط بھی ہیں۔ بعض لحاظ سے کسی خاص شعبے کی مہارت خصوصی بڑی اچھی چیز ہوتی ہے بلکہ زندگی کی پیچیدگی اور آدمی کے عمر کے اختصار کی وجہ سے یہ کچھ ضروری بھی ہے کیوں کہ کوئی فرد واحد اطمینان بخش علم و دانش کے تمام شعبوں پر قدرت حاصل نہیں کر سکتا، وہ زیادہ عرصہ تک زندہ بھی نہیں رہتا، اس لیے کسی ایک شعبے میں مہارت خصوصی پیدا کر لینا اس کے لیے ضروری ہے مگر اس کو ایک 'لازمی برائی' (اور مجبوری) تصور کرنا چاہیے۔ ایک ماہر خصوصی (اسپیشلسٹ) اپنے آپ کو کسی خاص حلقے میں محصور کر لیتا ہے اور یہ حلقہ بڑا تنگ اور محدود ہوتا ہے، اس کی فکر و نظر محدود ہو کے رہ جاتی ہے، اس کا احساس تناسب ضائع ہو جاتا ہے پھر وہ اشیا پر نگاہ صحیح تناسب سے ڈال ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اسے یاد رکھنا ہے کہ زندگانی کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں کاٹ کاٹ کر تقسیم نہیں کیا جا سکتا، علم و دانش کی مختلف شاخیں باہم پیوست اور مربوط ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا ہیں، ایک وکیل کو اگر علم طب بھی حاصل ہو تو وہ بہتر وکیل ہو سکتا ہے، ایک ڈاکٹر اگر علم النفس بھی حاصل کر لے تو اس کی افادیت میں اضافہ ہو جائے گا اور بقول ایلیٹ اگر شاعر نقاد بھی ہو تو وہ بہتر شاعر ہوگا۔

تنقید کی بہت سی اور خصوصی شکلیں تو سامنے آئی نہیں، بس ایک ہی شکل ادبی تنقید کے نام سے سامنے آئی تو اس پر خوب خوب سب و شتم ہوئی، لعنت لے دے ہوئی۔ 'ادبی تنقید' اپنی ذات سے الگ کسی دوسری چیز سے متعلق ہوتی ہے اور یہ دوسری چیز ادب ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ ادب کے بغیر خود اس کا کوئی وجود نہیں، تو پھر یہ ایک 'طفیلی' ہوئی، حالاں کہ طفیلی کا لفظ اس کے لیے کسی طرح صحیح نہیں۔ تنقید اپنے عمومی اور ہمہ گیر مفہوم میں جہاں فیصلوں کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہو، عقل و فہم کے آزادانہ عمل اور فرق و امتیاز کے احساس و شعور کا معاملہ ہو صرف ادب ہی سے متعلق نہیں ہوتی (اگر واقعی کسی چیز سے متعلق ہونا ہی اس کے لیے ضروری ہو) بلکہ حیات سے متعلق ہوتی ہے، تنقید تو ختم ہی اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ خود حیات ختم ہو جائے، تنقید کو وجود میں لانے والی تو حیات ہی ہے اور پھر اپنے تسلسل و ارتقا میں اسی پر انحصار بھی کرتی ہے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: متوازی ہندی سنیما

صفحہ ۸ سے آگے

زمانے کے بعد وہ مقبول عام سیاسی لیڈر آرتی دیوی کے طور پر اپنی پارٹی کی الیکشن مہم کے لیے کسی علاقے کے ایسے ہوٹل میں قیام کرتی ہے، جس کا منیجر اُس کا شوہر (سنجیو کمار) ہے۔ شام زندگی کے اس پڑاؤ میں دونوں عمر رفتہ کی رہ گزر پر چند قدم ساتھ ساتھ چل پڑتے ہیں، جسے مخالف لیڈر اور میڈیا ایک افیر (Affair) کی طرح مشتہر کرتا ہے، لیکن آخر میں بھولے بسرے ہی سہی، اپنے جائز رشتے کے بارے میں آرتی دیوی کی جرأت اظہار اُسے لوگوں میں اور زیادہ ہردل عزیز بنا دیتی ہے۔ 'گھروندا' میں بمبئی کی ایک فرم میں ملازم پریمی جوڑا (امول پالیکر اور زرینہ وہاب) اپنا گھر بسانے کے لیے گھر خریدنے کا متحمل نہیں ہے۔ اس فرم کے معمر اور دل کے مریض باس (شری رام لاگو) کو اپنی طرف مائل بہ کرم بلکہ شادی کا خواہاں پاکر پریمکا اپنے پریمی کے منصوبے کے تحت یہ سوچ کر اپنے باس سے شادی کر لیتی ہے کہ چوں کہ باس کا کوئی وارث نہیں ہے اور وہ زیادہ دنوں جی نہیں سکے گا اس لیے بعد میں وہ اپنے پریمی کے ساتھ اپنی پسند کی زندگی گزارے گی، لیکن پانسہ یوں پلٹتا ہے کہ شادی کے بعد اُس کے باس کی صحت میں سدھار آتا جاتا ہے۔ اپنی بیوی پر اُس کی مہربانیاں، شفقتیں اور اعتماد کی زنجیر اسے بے وفائی سے روکتی ہے، اور بالآخر وہ اپنے عاشق ہی کو مسترد کر دیتی ہے۔ 'ساتھ ساتھ' کی متمول باپ کی بیٹی (دیپتی نول) اپنے غریب عاشق (فاروق شیخ) کی اُصول پسندی، سادہ مزاجی اور بلند آدرشوں سے اپنی ذہنی وابستگی کی بنا پر اپنا جیون اُس سے وابستہ کر لیتی ہے، رفتہ رفتہ اُس کے شوہر کے لچھن بدلتے ہیں اور وہ اپنے آدرش بھول کر زیادہ دولت کی چاہ میں مخرب الاخلاق لٹریچر کی اشاعت کا منصوبہ بناتا ہے، تب وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ 'میرا باپ نائلون میں سوت ملاتا ہے اور ایک بنیا گیہوں میں کنکر ملاتا ہے تو وہ دونوں مجرم ہیں، لیکن تم اُن دونوں سے بھی بڑے مجرم ہوگے جب کلچر کو آلودہ کروگے، اس لیے یا تو تم اپنا ارادہ بدل ڈالو یا مجھے اپنا راستہ الگ کرنے دو۔ نتیجے میں صبح کا بھولا (ہیرو) شام کو گھر لوٹ آتا ہے۔ شاما سانیال کے سوانحی ناول 'بے گھر' پر بنی فلم 'صبح' تو واضح طور پر فیمنزم کے پیغام کی حامل ہے، جس میں ایک ایڈووکیٹ (گریش کرناڈ) کی بیوی (سمیتا پاٹل) اپنے شوہر کے ذریعے زنا کے ایک ملزم کی پیروی کیے جانے پر خفا ہوکر اور متاثرہ کی ہمدردی میں بہبودی نسواں کے آشرم سے جڑ جاتی ہے، لیکن مہیلا آشرم میں وہ اپنی اصلاحی کوششوں کی مخالفت، کرپشن، اور بدانتظامی کے مقابل خود کو ناتواں پاتی ہے، ایسے عالم میں جب اس کا پتی نئی جیون ساتھی ڈھونڈ لیتا ہے اور خود اپنے گھر میں وہ اپنے لیے جگہ نہیں پاتی تو اپنے وجود پر پڑی یہ ضرب اسے ایک نئی توانائی اور حوصلے کے ساتھ اپنی زندگی حقوق نسواں کے لیے وقف کرنے پر مائل کر دیتی ہے۔

وہ انتہائی غیر معمولی طور پر متاثر کن کہانیوں پر بنی اپنے ہدایت کاروں کی غالباً شاہکار فلمیں شاید ہی بھلائی جاسکیں۔ میرا روئے سخن وی شانتا رام کی 1972ء میں ریلیز ہوئی فلم 'پنجرہ' اور مہیش بھٹ کی 1984ء کی فلم 'سارانش' کی طرف ہے۔ 'پنجرہ' کو جرمن ڈائرکٹر سٹرن برگ کی 1930ء کی فلم Der blaue Engel کی باز ساختہ (remake) بتایا گیا ہے، جس کا ہندی رسم الخط روپ بابا بی پاٹل نے تیار کیا تھا۔ یہ ایک معزز اور آدرش وادی ٹیچر اور تماشہ ڈانسر کی کہانی ہے۔ ڈانسر سے ابتدا میں نفرت کرنے والے ٹیچر کو بعد ازاں اُس کے حسن پر فریفتہ ہوکر اسی کی چوکھٹ پر پڑا دکھایا گیا ہے، جب کہ اُس کی گم شدگی کے بعد گاؤں والوں نے اسے لیجنڈ بنا لیا ہے۔ کہانی مختلف نشیب و فراز کے بعد اس انجام کو پہنچتی ہے کہ اسے تماشے کے ایک بے شناخت (لاش) کارندے کی طرح ٹیچر کے (اپنے ہی) قتل کے جرم میں عدالت کے کٹہرے میں لایا جاتا ہے۔ اس فلم کا یہ المیہ انجام تو بھلائے نہیں بھولتا کہ وہ اپنی اصلیت ظاہر کرکے بچنا رہنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے بے شناخت وجود میں مرنا چاہتا ہے تاکہ اُس کا آدرش وادی بت جو لوگوں نے اپنے دلوں ہی میں نہیں بلکہ گاؤں کی چوپال پر بھی تعمیر کر رکھا ہے، قائم رہے اور بالآخر مرجاتا ہے۔ ڈانسر اس کرب میں مرتی ہے کہ وہ جس پر جان دیتی ہے اُسے بچا نہیں پاتی۔ اس طرح یہ فلم بتاتی ہے کہ موت نے کس طرح انھیں اُن کے بندھن (پنجرے) سے آزاد کر دیا۔ 'سارانش' میں بتایا گیا ہے کہ شہر میں مقیم ایک معمر جوڑا (انوپم کھیر اور روہنی ہٹنگڑی) جو پردیس میں ملازم اپنے جوان بیٹے کی موت کے بعد زندہ رہنے کی دل چسپی کھو بیٹھا ہے کس طرح اپنے یہاں پیئنگ گیسٹ کے طور پر مقیم ایک جوان جوڑے کو بالخصوص حاملہ عورت کو اُس کے سر پر ایک بدکردار لیڈر کے مسلط کیے خطروں سے اُسے بچانے کے لیے اپنا وجود داؤ پر لگا دیتا ہے۔

سعید اختر مرزا کی 'موہن جوشی حاضر ہو!' اور باسو چٹرجی کی 'ایک رُکا ہوا فیصلہ' 1986ء کی ان دونوں فلموں میں ہمارے عدالتی نظام کی کچھ تلخ سچائیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ریٹائرڈ کلرک موہن جوشی (بھیشم ساہنی) اپنے خراب وخستہ مکان کی مرمت کے لیے اپنے حریص لینڈلارڈ کو آمادہ کرنے میں ناکام رہتا ہے اور عدالت کی صبر آزما لمبی کارروائیوں، وکیلوں کی سانٹھ گانٹھ اور لینڈلارڈ کے پُرفریب ہتھکنڈوں کی وجہ سے انصاف کی اُمید بھی چھوڑ بیٹھتا ہے تو وہ اُس عمارت (chawl) کے کمزور سہاروں کو خود ہی گرا کر اس کے ملبے تلے مرجاتا ہے۔ باسو چٹرجی کی فلم میں قتل کے ایک مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک کمرے میں اکٹھے ممبران جیوری کو دوران بحث بار بار مقدمے کی سنگینی سے ہٹ کر غیر اہم باتوں میں اُلجھتے، غیر ضروری تکرار کرتے اور اپنے فرض کے تئیں غیر مخلص ہوتے دکھایا گیا ہے۔ ڈائرکٹر کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی فلم ایک ہی کمرے میں آخر تک دل چسپی برقرار رکھتے ہوئے مکمل کی ہے۔

(باقی آئندہ)

✦✦✦✦✦

دوسری قسط

متوازی ہندی سینما

اسیم کاویانی
فلیٹ نمبر 702، کیپٹن اپارٹمنٹ
بلویدر روڈ، بجگاؤں، ممبئی-10
E-Mail: aseemkavyani@gmail.com

1979ء میں ریلیز ہوئی فلم 'گرہ پرویش' میں بنتے بکھرتے شادی شدہ جوڑے (سنجیو کمار، شرمیلا ٹیگور) کی زندگی میں اُس وقت بدگمانیوں کے سائے منڈلانے لگتے ہیں جب اُن کے بیچ شوہر کی حسین پرسنل سکریٹری (سارِکا) حائل نظر آتی ہے۔ شوہر راہ سے بھٹکتا تو ہے پر آخر میں اُسے اپنے گھر، بیوی اور بچے کی اہمیت کا احساس کرکے گرہ پرویش کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس Trilogy کے علاوہ 1997ء میں آئی باسو بھٹاچاریہ کی آخری فلم 'آستھا' میں بھی اُن کی اپنے پسندیدہ موضوع سے دلچسپی برقرار ملتی ہے۔ یہ شہری زندگی کی مادیت میں اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے میں کوشاں ایک ایسے جوڑے (اوم پوری، ریکھا) کی کہانی ہے جن کی زندگی میں تعیشات اور تکلفات کی کوئی گنجائش نہیں۔ شوہر کلرک ملازم ہے اور بیوی خاتون خانہ۔ جب یہ خاتون اپنی بچی کو مہنگے جوتے نہیں دلا پاتی تو اُس کی ایک دنیادار شناسا (ڈیزی ایرانی) اُسے متمول آدمی کی ترغیب دلاکر جزوقتی سیکس جاب کے لیے آمادہ کر لیتی ہے۔ اس طرح کی آمدنی سے جہاں وہ اپنی گرہستی کی کچھ ناآسودہ ضروریات کی کفالت ہو جاتی ہے وہیں اُس کا احساسِ پشیمانی بڑھتا جاتا ہے۔ بیوی کے اس مشغلے کا پتا چلنے کے بعد اُس کا شوہر اپنی خود احتسابی کرتا ہے اور اپنی پشیمان بیوی کو معاف کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اتفاق سے یا قصداً ان چاروں فلموں میں میاں بیوی کے کرداروں کو 'امر' اور 'مانسی' نام دیے گئے ہیں۔

ہدایت کار پرتاپ شرما کی فلم 'پھر بھی' (1971ء) کی نوخیز ہیروئن اپنے باپ کو دنیا کا مثالی انسان سمجھتی ہے۔ ڈائرکٹر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اُس کی تصوراتی دنیا کو پیش کیا ہے جہاں وہ اپنے جیون ساتھی میں اُسی پیار محبت، احساسِ تحفظ بلکہ شباہت تک کی جویا نظر آتی ہے جو وہ اپنے باپ میں دیکھتی ہے، اور اس سے کم پر سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ باپ بیٹی جیسا ہی رشتہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ تناظر میں ڈائرکٹر گلزار نے 1975ء میں اپنے کریئر کی بہترین فلم 'موسم' میں پیش کیا تھا۔ کملیشور کی لکھی اس کہانی میں ایک ڈاکٹر (سنجیو کمار) اپنی پیشہ ورانہ غفلت کی سزا کاٹ کر بیس سال بعد ایک ہل اسٹیشن پر اپنی محبوبہ کی تلاش میں لوٹا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ وہ اُس کے انتظار میں، اپنی جبریہ شادی کے نتیجے میں ایک بچی کو جنم دینے کے بعد مر چکی ہے۔ ڈاکٹر کو نہ صرف اُس کی مجبوری حالات کی ماری بچی کا ایک طوائف کے روپ میں سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ اُسے گاہک سمجھے جانے کے اُس کے برتاؤ اور اُس کے دل میں بھی اپنی ماں کی مظلومیت کے ذمے دار (ڈاکٹر) کے لیے نفرت کو دور کرنے کے جاں سوز مرحلوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ازدواجی تعلقات کے حقیقت افروز اظہار نے متوازی ڈائرکٹروں کو نہ صرف زن و شو کی نفسیاتی اور جنسی گرہوں کی عقدہ کشائی پر مائل کیا بلکہ اُن کی جنسی زندگی پر شہری تمدن کی کشاکش اور مادہ پرستی کی گرفت کے اثرات کو بھی بے لاگ پیش کرنے کا حوصلہ دیا۔

1970ء میں راجندر سنگھ بیدی نے اپنی ایک کہانی پر اپنی ہدایت کاری کی ابتدا کرتے ہوئے فلم 'دستک' بنائی تھی۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک شادی شدہ جوڑے (سنجیو کمار، ریحانہ سلطان) کو بمبئی کے ریڈ لائٹ علاقے میں کرایے کا فلیٹ لینے کے بعد کیسے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ بالآخر اس سنگ دل شہر کی جنسی مجبوریاں ہیروئن کو طوائف ہی کی راہ اختیار کر لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس فلم میں مجروح کا گیت 'بےجانہ دھرو' اور غزل 'ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح' بہت مشہور ہوئے تھے۔ اسی برس ریلیز ہوئی بی آر اشارہ کی فلم 'چیتنا' میں بتایا گیا تھا کہ طوائف اسی سماج میں پنپتی غلط کاریوں اور معاشی مجبوریوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ اس فلم نے اپنے بیڈروم مناظر کی وجہ سے ہلچل پیدا کر دی تھی۔ ڈائرکٹر کے ایس سیتھو مادھون نے 1975ء میں اپنی فلم 'جولی' پیش کی، جو پنجن کے ملیالم ناول سے اندر راج آنند کی اخذ کردہ کہانی پر مبنی تھی۔ اینگلو انڈین دوشیزہ جولی (لکشمی) اپنے مخلص بوائے فرینڈ کو نظرانداز کرکے اسمارٹ اور کائیاں وکرم سے پینگیں بڑھاتی ہے اور حاملہ ہو جاتی ہے۔ آخر میں پرانا ساتھی ہی کام آتا ہے۔ لکشمی کی سیکس اپیل کے علاوہ اس فلم کا ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے کا لکھا اور پریتی ساگر کا گایا ہوا گیت 'My heart is beating' کافی چرچا میں رہا تھا۔ ڈائرکٹر ونود پانڈے نے 1980ء میں اپنی ہی لکھی کہانی پر فلم 'ایک بار پھر' پیش کی تھی۔ کہانی کی مڈل کلاس حسینہ (دیپتی نول) ایک مشہور فلم اسٹار (سریش اوبرائے) کی بیوی بننے کی چاہ پر جوش و امنگ سے بھری ہوتی ہے، لیکن فلم اسٹار شوہر کی پیشہ ورانہ مصروفیتوں اور کم توجہی سے اُس کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے۔ ایک نوجوان طالب علم اور نو وارد پینٹر (پردیپ ورما) سے جنسی تعلق قائم کرنے پر وہ اپنے آپ کو قصوروار تو سمجھتی ہے لیکن اپنے ناآسودہ جذبات کی تسکین کے لیے اپنے بڑھے قدم پیچھے ہٹانے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ ان ہی جذبات کے ارتقا کی کہانی فلوبرٹ (Flaubert) کی مادام بواری سے متاثر ہوکر 1992ء میں کیتن مہتا نے 'مایا میم صاب' میں پیش کی تھی۔ یہ مایا (دیپا شاہی) ایک خوش حال ڈاکٹر (فاروق شیخ) کی بیوی ہے، لیکن جمود پسندی اور رٹے بندھے معاشقے (شاہ رخ خان، راج ببر وغیرہ) جب اُسے سفر طے کرکے بالآخر تباہی کی منزل پر پہنچا دیتے ہیں تو اس وقت بھی وہ اپنی عیش پرستی کے ماضی میں کھوئی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ کہ مایا کے معنی سراب کے ہیں۔

کچھ مخصوص حالات اور پس منظر میں متاہلانہ رشتوں کی نرم و نازک کیفیتیں مظفر علی اور سئی پرانجپے کی ہدایت کاری کی اولین ہندی فلموں (بالترتیب) 'گمن' اور 'اسپرش' میں انتہائی حساس طریقے سے پیش کی گئی ہیں۔ 'گمن' (1978ء) کی ہردے لانی کی لکھی کہانی میں تلاشِ روزگار میں لکھنؤ سے بمبئی شہر میں پہنچ کر وہاں کے مسائل سے نبرد آزما نوجوان اور یہاں اُس کی بیوی کی مجبوری اور فکر مندی کے جذبات کی دردمندانہ تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس فلم میں سریش واڈکر کی آواز میں شہریار کی غزل 'سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے' بہت مقبول ہوئی تھی۔ اسی طرح 'اسپرش' (1980ء) میں پرانجپے ہی کی لکھی نابیناؤں کے اسکول کے ایک نابینا پرنسپل (نصیر الدین شاہ) کی کہانی پیش کی گئی ہے جو خود کی طرح اپنے طلبہ سے بھی خود انحصار بننے کی توقع رکھتا ہے۔ پرنسپل کے کردار سے متاثر ہوکر سماجی خدمت گار شبانہ اعظمی اُس سے شادی کر لیتی ہے کہ وہ اُس کا سہارا بنے، لیکن شادی کے بعد بھی پرنسپل خود اکتفا رہنا پسند کرتا ہے اور یہ گوارا نہیں کرتا کہ اُسے زیرِ کرم سمجھا جائے۔

ستر کی دہائی اور اس کے بعد کئی ایسی فلمیں ہیں جو ایک طرح سے متوازی سینما میں Feminism کے رخ کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً ڈائرکٹر ایچ کے ورما کی 'کادمبری' (1976ء)، گلزار کی 'آندھی' (1975ء)، بھیم سین کی 'گھروندا' (1977ء)، ڈائرکٹر رمن کمار کی 'ساتھ ساتھ' (1981ء) اور جبار پٹیل کی 'صبح' (1981ء)۔ ان فلموں کے نسائی کردار زمانہ شناس ہیں اور زمانہ ساز بھی ہونا چاہتے ہیں۔ وہ روایات کے اسیر نہیں ہیں اور زندگی کی مثبت قدروں پر یقین رکھتے ہوئے حقیقت سے مقابلے کا حوصلہ رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان فلمی کہانیوں کے انجام کو مرد نہیں عورت طے کرتی ہے۔

امرتا پریتم کے ناول 'دھرتی، ساگر، سیپیاں' پر بنی 'کادمبری' کی ہیروئن (شبانہ اعظمی) اپنے محبوب (اجے اروڑا) کے کچھ وجوہ سے شادی نہ کرنے کے فیصلے کو کھلے ذہن سے قبول کر لیتی ہے، لیکن اس کے بچے کو ضائع نہیں کرتی بلکہ اپنی خود اعتمادی اور خود کفالتی کے بل بوتے پر اُس کی پرورش کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ 'آندھی' کی تعلیم یافتہ... (سچترا سین) خود کے سلسلے میں اپنے باپ (رحمان) کے عزائم کو پورا کرنے کے لیے اپنی لو میرج ختم کرکے اپنے بچے کو بورڈنگ میں داخل کر دیتی ہے۔ ایک...

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: نرگس آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org